اختر حسین جعفری

دل سے کب اُس کی یاد جاتی ہے

''کیوں نہ ایسا ہو کہ ہم جس طرح آج مل بیٹھے ہیں' اسی طرح ہفتے میں ایک دن یا شروع میں بے شک دو ہفتوں میں ایک دن' ایک جگہ جمع ہوں۔ ہم میں سے کوئی اپنی تازہ غزل سنائے' کوئی اپنی نظم پیش کرے اور کسی نے اگر نثر میں کوئی چیز لکھی ہو تو وہ پڑھ کے سنائے۔ پھر اس پر ایک بے تکلفانہ سی گفتگو ہو' تبادلۂ آرا ہو' جو ادبی موضوعات کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے اور زندگی کے عام مسائل کے بارے میں بھی! اس چھوٹے سے حلقے کا کوئی نام نہیں ہونا چاہیے اور نہ اس کے کوئی عہدیدار ہوں۔ بس کچھ ہم مزاج لوگوں کے مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کے خیالات و احساسات سے آگاہ ہونے کا ایک موقع بہم پہنچنا چاہیے جو آج کل کی زندگی میں کم ہی نصیب ہوتا ہے۔''

کچھ ایسی ہی تجویز تھی۔ الفاظ شاید یہ نہ ہوں لیکن مدعا کم و بیش یہی تھا جس پر ہم سب نے بڑے شوق اور امنگ کے ساتھ اتفاق کیا' ہم کل چھ افراد تھے جو ایک جنازے سے واپسی پر اختر حسین جعفری کے گھر میں جو راستے میں پڑتا تھا' ٹھہر گئے تھے۔ جب ہم تھکے ہارے اس کے گھر پہنچے تو جعفری نے جو ہمارے ساتھ ہی آیا تھا' اپنی عادت کے مطابق ٹھنڈے مشروبات اور مٹھائی اور دوسرے ماکولات کے ساتھ ہماری تواضع کی۔ کھا پی کر جب ہم ذرا آسودہ ہوئے اور آنکھوں میں چمک آئی تو ہم نے اختر حسین جعفری سے اس کی تازہ تخلیق ''نومبر کے پہلے ہفتے پر ایک نظم'' سننے کی فرمائش کی۔ جعفری نے پہلے تو اچنبھے سے ہمیں اس طرح دیکھا گویا جاننا چاہتا ہو کہ واقعی ہم سنجیدہ ہیں۔ جب ہم نے اپنی فرمائش پر اصرار کیا تو وہ اپنی پاٹ دار آواز اور اپنے مخصوص درد بھرے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر ہمیں وہ نظم سنانے لگا:

......دھواں دھواں شام کے الاؤ میں کوئی جنگل جلے
کہ روٹھی ہوئی تمنا

خزاں کا پانی کوئی اشارہ نہیں سمجھتا
یہ نہر اب تک پرانے پہرے میں چل رہی ہے......

کچھ اس نظم اور کچھ جعفری کے پڑھنے کے انداز نے ایسا سماں باندھا کہ ہم سب اس کے سحر تلے

آ گئے۔ رشید ملک ایک عالمِ وارفتگی میں اپنے پائپ کے کش پر کش لینے لگے۔ خالد احمد جو بیچ کی تپائی کے ساتھ لگا نیچے بیٹھا تھا، کچھ دیر کے لیے کھانا پینا بھول گیا اور نجیب احمد جو دوسری طرف صوفے پر دراز تھا، بالکل بت بنا یہ کلام سن رہا تھا۔ نظم جب ختم ہوئی تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ اگر اختر حسین جعفری کا کلام ٹھیک سے سمجھنا اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا ہو تو اسے خود شاعر کی زبان سے سننا چاہیے۔ شاعر کی زبان سے سننے کے بعد کم از مجھ پر اس نظم کی کچھ ایسی ابعاد (Dimension) آشکار ہوئیں جن کی طرف یہ نظم پڑھتے ہوئے پہلے میرا خیال نہیں گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ہم نے اس نظم اور اس کے پس منظر کے بارے میں ایک سادہ اور بے ساختہ سی گفتگو کی جو میں سمجھتا ہوں اپنے اندر افادیت کے بہت پہلو رکھتی تھی۔ بات سے بات چلی اور ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اس طرح کی نشست ہم وقفے وقفے سے باقاعدگی کے ساتھ منعقد کیا کریں اور دوسرے ہی لمحے اس خیال نے اس تجویز کی صورت اختیار کی جس کا ذکر اوپر شروع میں آیا۔

افسوس کہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی تفصیلات طے نہ کی جا سکیں اور نہ پہلی نشست کے لیے جگہ اور تاریخ کا تعین کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دن اتفاق سے جمع ہونے والے اس گروہ کے افراد اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور اس واقعے پر دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اختر حسین جعفری ہم سب کو چھوڑ کر آ گے چل دیا!

جعفری کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اپنی نظموں میں تو وہ اپنے دل کی بات کہتا ہی رہتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ شاعری کا ایک بہت قابل نقاد بھی تھا اور اس کی نظر نہ صرف اردو شاعری پر بلکہ انگریزی اور مغربی شاعری پر بھی بہت وسیع اور گہری تھی۔ ایذرا پاؤنڈ، ایلیٹ، پابلو نرودا اور رلکے جیسے شاعروں کو اس نے پڑھ رکھا تھا اور ان کے تنقیدی نظریات اور تخلیقی رویوں سے وہ اچھی طرح واقف بھی تھا اور خاصی حد تک ان سے متاثر بھی! اس دن کی تجویز کے مطابق اگر ہمارا یہ چھوٹا سا ادبی کلب قائم ہو جاتا تو میرا خیال ہے اختر حسین جعفری کو ہم لوگوں سے کچھ حاصل ہوتا یا نہ، ہم اس سے جدید شاعری کی مقامی اور عالمی روایت کے بارے میں بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔

جعفری کے ساتھ میری طویل ملاقاتیں بس گنتی کی رہی ہوں گی۔ اگرچہ ایک زمانے میں ''فنون'' کے دفتر میں ہم ہفتے میں ایک یا دو بار ضرور اکٹھا ہوتے تھے۔ ان چند طویل ملاقاتوں میں جعفری کی گفتگو کا موضوع آج کی اردو نظم، اس کے اہم نمائندے اور اس شاعری پر اثر انداز ہونے والی مغربی شعری روایت ہوتی تھی۔ اس موضوع پر اس کی معلومات کا ذخیرہ حیران کن تھا۔ اس نے مغرب کی اچھی شاعری ہی نہ پڑھی تھی، اس شاعری کے ممتاز نقادوں کو بھی پڑھا تھا۔ اس کی باتیں سننے کے بعد مجھے یوں لگتا جیسے شاعری کی سی اہم ادبی صنف کو میں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ اس کے بارے میں کبھی سوچنے اور پڑھنے کی ضرورت محسوس کی ہے، جو ادب کے ایک سنجیدہ قاری کے لیے شرم کی بات ہے۔ چنانچہ میں اس کے ہاں سے ہمیشہ یہ عزم لیے

ہوئے اٹھتا کہ اب میں اپنی اس کوتاہی کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اب سوچتا ہوں کہ ان ملاقاتوں میں اختر حسین جعفری جو کچھ کہتا تھا' اگر گھر آ کر میں اس کے کچھ نوٹس لے لیا کرتا تو فن شعر کے بارے میں جعفری کی آراء اور نظریات کا ایک اچھا ذخیرہ میرے پاس جمع ہو جاتا۔

ابھی کوئی دو سال اِدھر میری اس سے اسی طرح کی ایک لمبی ملاقات ہوئی۔ ہم ''مجلس ترقی ادب'' کے دفتر سے اٹھے اور لاہور کے ہوائی اڈے پر گئے جہاں ان دنوں وہ کسٹمز کے محکمے میں کوئی اونچا افسر لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اسے وہاں اس دن کیا کام تھا' ہم مسافروں کی آمد والے لاؤنج میں داخل ہوئے اور ایک طرف کمرے میں جا بیٹھے۔ لاؤنج میں متعین عملہ سراپا احترام بنا بڑی چستی اور مستعدی کے ساتھ ہماری خاطر مدارات میں لگا ہوا تھا۔ اس دن ہم نے چائے پر بڑے امن وسکون کے ساتھ ادب وشعر کی باتیں کیں۔ یہ ساری باتیں تو مجھے اب یاد نہیں رہیں' ہاں ان کا ایک تھوڑا حصہ میں اپنے حافظہ کی مدد سے بیان کر سکتا ہوں۔ اس میں کوشش کروں گا کہ جعفری کی زبانی جو بھی بات ہو' وہ جہاں تک ہو سکے' اس کی اپنی ڈِکشن میں بیان ہو۔

آج کی نظم کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ جعفری کہنے لگا: آپ نے بھی یہ محسوس کیا ہو گا کہ آج کی غزل کے مقابلے میں ہماری آج کی نظم زیادہ جدید اور نئے لہجے کی حامل لگتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جدید نظم میں ہمارا سارا محاورہ Barrowed ہے جبکہ ہماری غزل جدید ہوتے ہوئے بھی کئی سطحوں پر کلاسیکی روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھتی ہے۔

نظم کے اچھے شعراء کا ذکر چلا تو جعفری نے کہا: کوئی شک نہیں کہ ظہور نظر نظم کا Committed شاعر تھا لیکن میں مجید امجد کو اس سے زیادہ نظم کے ساتھ Committed سمجھتا ہوں۔ ظہور نظر اس لیے زیادہ Prominent نہ ہو سکا کہ نظم میں اس کے معاصر میرا جی' ن۔ م۔ راشد اور پھر فیض' ندیم اور مجید امجد جیسے لوگ تھے۔ معاصر اگر قدآور ہوں تو انسان کی پہچان پوری طرح نہیں ہو پاتی اور وہ ان کے سامنے دب جاتا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ظہور نظر کا مسئلہ پی آر (تعلقات عامہ قائم کرنے) کا نہیں تھا جس کی طرف آپ نے اپنی ایک تحریر میں اشارہ کیا ہے بلکہ اس کا مسئلہ معاصرت کا تھا۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے جعفری نے کہا: احمد شمیم اور آفتاب اقبال شمیم اپنی جگہ دونوں نظم کے بہت اچھے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں مجھے اس کوشش کی کمی محسوس ہوتی ہے جو نظم کے اجنبی اور Borrowed محاورے کو اپنی ثقافت اور روایت کے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے کی جانی چاہیے۔ شاعر جب اجنبی نمونوں کو لے کر انہیں اپنے ماحول اور محاورے میں ڈھالتا ہے تو وہ نظم جدید ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاں کی نظم لگتی ہے۔ اپنی روایت سے رشتہ جوڑے ہوئے۔ لیکن یہ عمل نہ ہو سکے تو نظم اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔ افتخار جالب وغیرہ کے تجربے اسی وجہ سے ناکام ہو گئے تھے۔

باتوں کا سلسلہ جب آگے بڑھا تو میں نے جعفری کی اپنی شاعری کے بارے میں قدرے محتاط انداز میں اپنا خیال پیش کیا کہ اس کی نظم پڑھتے ہوئے ایک سے زیادہ پیکر (Images) سامنے آتے ہیں اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ نظم کو بار بار پڑھنے اور اس پر غور کرنے سے ان Images کا باہمی ربط مل جاتا ہے لیکن کبھی اس ساری کوشش کے باوجود یہ ربط نہیں ملتا اور یوں لگتا ہے کہ بیچ میں کچھ مصرعے تھے جو حذف ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں قاری نظم کے مصرعوں کی خوبصورت بُنت اور ان کے شاندار آہنگ ہی میں کھو جاتا ہے اور اپنی یہ کوشش ترک کر دیتا ہے۔ اس پر جعفری کچھ Formal سا ہو گیا۔ کہنے لگا: میں آپ کے اس خیال سے ایک حد تک ضرور اتفاق کروں گا لیکن میں اس میں آپ کے ساتھ پوری طرح متفق نہیں ہو سکتا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میری نظم کا ہر ایک مصرع الگ الگ ایک خاص صورت حال کے لیے امیج فراہم کرتا ہے اور یہ سب Images مل کر وہ فضا اور وہ Sensibility سامنے لاتے ہیں جو شاعر قاری کے ساتھ Share کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا کہ پوری نظم پڑھنے سے کوئی مربوط اور وحدانی تاثر قائم نہیں ہوتا' جدید نظم کے تقاضوں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ تو گویا جعفری کی مراد یہ تھی کہ جدید نظم کے اندر Multiple Images ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان امیجز کے موزیک کا ایک ہی طرح کا آسان فہم اور سیدھا سادا پیٹرن سامنے آئے۔ یہ پیٹرن Complex ہو سکتا ہے اور اپنی نوع میں تجریدی بھی!...... سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے جعفری نے کہا: آج کل ضیا جالندھری کا رسالہ ''علامت'' نکلنے لگا ہے۔ اس میں ضیا نے بھی میری شاعری کے بارے میں کچھ اسی طرح کے ریمارکس دیئے لیکن پھر اس کے ساتھ کئی دن میری طویل گفتگو ہوتی رہی اور اس کی یہ غلط فہمی بالآخر دور ہو گئی۔ اگرچہ اس کے لیے مجھے اس کے کئی کھانے کھانے پڑے!

اختر حسین جعفری اپنی شاعری کے بارے میں بے حد حساس تھا۔ ہمارے ہاں کے ایک معروف ادیب نے جب اس کے بارے میں یہ لکھا کہ جعفری کی نظم خوبصورت تو بہت ہوتی ہے لیکن وہ عموماً معانی اور مفاہیم کی کوئی جہت متعین نہیں کرتی' تو جعفری پر اس کا شدید اثر ہوا اور وہ میرے ساتھ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس موقع پر میں نے اس کے ساتھ جو بات کی وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے کہا ''اختر حسین جعفری! آپ کو اپنے مقام کی پہچان ہے یا نہیں؟'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں ہے' کیوں نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''تو پھر آپ کو اس کی پروا نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی آپ کے بارے میں کیا کہتا ہے...... اور ہاں اگر ضرورت پڑی تو آپ کی طرف سے جواب دینے کے لیے ہم میدان میں آئیں گے۔'' اس سے وہ وقتی طور پر خوش اور مطمئن ہو گیا لیکن میرے خیال میں اس کے دل کی خلش دور نہ ہوئی۔ جب تک کہ اس کی مداح ایک خاتون نے اس کے فن کے بارے میں معاملے کی اس طرح سے وضاحت نہ کر دی کہ ہم میں سے شاید کوئی بھی اس طرح نہ کر سکتا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اب سے بہت پہلے اس زمانے میں پیش آیا جب ''فنون'' کا دفتر انارکلی میں ایک عمارت کی دوسری منزل پر ہوتا تھا۔ اس میں ہم ایک دن حسب معمول جمع تھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ جناب علی عباس جلالپوری کو خدا جانے کیا سوجھی، انہوں نے اختر حسین جعفری کو مخاطب کر کے اس کی معاصر نسل کی اردو شاعری کے بارے میں سوال کیا کہ بتائیے تو سہی اس ساری شاعری کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ ان کے نزدیک گویا یہ محض قافیہ پیمائی کا ایک شغل بے کار تھا۔ یہ سن کر جعفری سکتے میں آ گیا اور سید صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ لیکن دوسرے ہی دن وہ مجھے ''فنون'' کے دفتر جانے والی سیڑھیوں میں مل گیا۔ اوپر پہنچ کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا ''سر! میں نے کل رات ایک غزل لکھی ہے، جو میں چاہتا ہوں آپ اندر جانے سے پہلے سن لیں۔'' اس نے غزل سنائی۔

نہ خشت ہاتھ میں میرے، نہ تیرے ہات میں تھی
شکستگی کی نمو آئینے کی ذات میں تھی

تعلقات تھے یا سرد پانیوں کا سفر
چلا تو برف سی قندیل میرے ہات میں تھی

میں بادِ ہجر سرِ دشت آرزوئے سحر
وہ شاخسار سی روشن اداس رات میں تھی

غزل سن کر میں نے کہا: آپ کی اس غزل کا تعلق کل کے واقعے سے تو نہیں ہے؟ جواب میں جعفری کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگا: کاظم صاحب میں آپ سے سچ کہتا ہوں، کل کے اس واقعے سے میں رات بھر سو نہیں سکا اور جب تک یہ غزل نہیں ہو گئی میری آنکھ نہیں لگی۔

ظہور نظر کے معاملے میں تو جعفری نے پی آر کی اہمیت سے انکار کیا تھا لیکن خود اس نے اپنی پی آر سے غفلت برت کر اس کا یہ نقصان اٹھایا کہ نہ اس کے مرتبے کے مطابق اس کے نام کی شہرت ہوئی اور نہ اس کے کام کے بارے میں نقادوں اور مبصروں نے کوئی زیادہ گفتگو کی۔ مختلف ادبی اصناف کے انتخاب کا ایک سلسلہ ''پاکستانی ادب'' کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی پانچویں جلد (تنقید) میں دو فاضل نقادوں نے جدید اردو نظم پر مضامین لکھے تو ان میں سے کسی نے بھی اختر حسین جعفری کو ذکر کے قابل نہ سمجھا۔ اسی طرح کچھ عرصہ ہوا ''سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ'' کے عنوان سے ہندوستان کے نامور نقاد گوپی چند نارنگ کی ایک کتاب آئی۔ اس پر میں نے ایک سرسری نظر ڈالی تو اس میں مجھے اختر حسین جعفری کا نام کہیں دکھائی نہ دیا۔ یہ ایسے تھا جیسے کوئی اردو شاعری میں مردِ مومن کا استعارہ ڈھونڈنے نکلے اور اقبال کو نظر انداز کر جائے۔

شاید ایسی ہی صورت حال کو دیکھ کر اختر حسین جعفری نے اپنی شخصیت کے اظہار کا ایک دوسرا راستہ

نکالا۔اس نے ''فروا'' کے نام سے ایک کتابی سلسلے کی اشاعت کا آغاز کیا جو بہت ہی معیاری اور منتخب تخلیقات اور مضامین کا ایک بیش قیمت مجموعہ تھا۔اس سلسلے کا پہلا نمبر جب تیاری کی منزل میں تھا تو جعفری نے مجھ سے جدید عربی شاعر ایڈونس کے ترجموں یا اس کی شاعری کے بارے میں ایک تنقیدی مقالے کی فرمائش کی۔ پتہ نہیں ایڈونس کا نام اس نے کہاں سے سن لیا تھا اور کہاں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ میں نے اپنے پاس موجود عربی رسالوں میں اس شاعر کی چیزیں تلاش کیں لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملیں اور ''فروا'' کا پہلا شمارہ شائع ہو گیا۔اب وہ اس کے دوسرے نمبر کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ایک دن ملا تو کہنے لگا: ''سر! فروا کے پہلے شمارے سے تو آپ غائب رہے لیکن اس دفعہ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔اس دفعہ آپ اس کے لیے ضرور کوئی چیز لکھیں گے۔ میں آپ کے لیے کوئی موضوع متعین نہیں کروں گا۔''

انسان کے انہی منصوبوں' آرزوؤں اور امنگوں کا نام زندگی ہے۔اگر ہمارا وہ منصوبہ بھی عمل میں آ گیا ہوتا جس کے مطابق ہم لوگوں کو ہفتے میں ایک روز ایک جگہ جمع ہونا تھا تو اختر حسین جعفری کے ساتھ مل بیٹھنے کے لیے کیسے کیسے مواقع بہم پہنچتے لیکن اب؟ ایک شاعر کہتا ہے:

ملیں گے اب بھی' مگر آہ! کب؟ کہاں؟ کیوں کر؟